© rasailojaraid.com

مولانا غلام رسول مہرؒ

نادر الاوصاف شخصیت

چگو نہ مئے بہ میاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمست اند

تقریباً چالیس سال پیشتر کی بات ہے کہ ترکِ موالات یا عدم تعاون کی تحریک کے پاک و ہند کی بوقلموں وسعتوں نے چپے چپے میں وہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی کہ طوفانی سمندر کی سطح کو بھی شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔ ہر ملت و قوم کی آزادی کے مختلف طبقات جوش و خروش سے تحریک میں شامل ہو رہے تھے۔ برطانوی قہرمانی بھی آخری حد تک پہنچی تھی۔ نظام دار و گیر کے تمام عناصر اپنے اختیارات انتہائی شدت سے استعمال کر رہے تھے تاکہ پوری فضا ہیبت و دہشت سے معمور ہو جائے۔ فدا کاران ملک و ملت ہزاروں کی تعداد میں جیلوں کے اندر پہنچ چکے تھے۔ پھر بھی جدھر نظر اٹھتی تھی ہر عمر، ہر صنف، ہر پیشے اور ہر درجے کے کارکن اس زور و شور سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے فوارے سے پانی کی لہریں اٹھتی ہیں یا چشمے ابلتے ہیں۔ گویا قضا و قدر کی یادگار میں طے ہو چکا تھا کہ تمام جیل بھر جائیں گے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ختم ہو جائیں گی۔ گرفتار کرنے والے ہاتھ تھک جائیں گے۔ سزائیں تجویز کرنے والے قلم خشک ہو جائیں گے مگر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے والوں کے سیل کا تموج تلاطم کم نہ ہوگا۔ تیز تر ہوتا چلا جائے گا۔ یہ اپنی نوعیت کی بالکل یگانہ اور عجیب و غریب جنگ تھی۔ جس نے پہلی مرتبہ اس وسیع سرزمین میں انگریزی اقتدار کی بنیادیں جڑوں تک اس طرح ہلائیں کہ پھر انہیں جماؤ نصیب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ربع صدی کے بعد اس کی بساط ہمیشہ کے لئے لپیٹی گئی۔ جس سلطنت کے لئے فخر کا سب سے بڑا سرمایہ یہ تھا کہ اس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا وہ ماضی کا ایسا ہی خیالی افسانہ بن گئی ہے۔ جیسے ہزاروں افسانے اس سے پیشتر موجود تھے۔ سلطنت کیا تھی تاش کے پتوں کا ایک گھروندا تھا کہ اس میں سے ایک پتہ کھسکا تو سارا گھروندا درہم برہم ہو گیا۔

محبت و عقیدت کا پہلا نقش

میں اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام سنا۔ لوگ ان کے بیان و خطابت کی سحر انگیزی اور زور و تاثیر کی ستائش ایسے انداز میں کرتے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ اس میں حقیقت کی جگہ افسانے کا رنگ غالب ہے۔ میں نے ۱۹۲۲ء میں اخبار نویسی شروع کی تو اکثر بڑے بڑے لیڈر اور کارکن قید ہو چکے تھے۔ ان میں خود شاہ جی بھی شامل تھے۔ سزائے قید سنا دینے کے بعد انہیں میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ جو عام گزرگاہ سے ہٹا ہوا تھا۔ اور وہاں بالقصد جانے والے لوگوں کے سوا کسی کے پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ شاہ جی کے بعض رفیق اور دوست پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بعض بعد میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہاں پہنچ گئے۔ بہرحال اس وقت مجھے شاہ جی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ سالک مرحوم ۱۹۲۱ء کے اواخر میں قید ہوئے تھے انہیں بھی میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہ نومبر ۱۹۲۲ء میں رہا ہو کر آئے تو ان کے ساتھ اخوت و رفاقت کا وہ پیمان استوار ہوا جو عملاً زندگی بھر کا پیمان بن گیا۔ وہ اکثر اپنے رفیقان اسیری کے احوال و وقائع و لطائف و ظرافت سناتے رہتے۔ مثلاً مولانا احمد سعید مرحوم ناظم جمعیت العلماء صوفی اقبال احمد مرحوم پانی پتی۔ مولانا عبداللہ مرحوم دہلوی چوڑھی والے، عبدالعزیز مرحوم انصاری، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی وغیرہم رفیقوں میں سے جس شخصیت کے ذکر پر مرحوم سالک کے انداز میں محبت و للہیت کی خاص شان پیدا ہو جاتی تھی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ اس طرح میرے دل میں شاہ جی کے متعلق محبت و عقیدت کے مخلصانہ جذبات پیدا ہوئے۔ اور اس مشہور شعر کی حقیقت کا عملی تجربہ پہلی دفعہ ہوا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

رشتۂ ناز کی استواری

شاہ جی قید کی مدت پوری کر کے رہا ہوئے تو کئی سال تک سیاسی دائرے میں ہم نے اکٹھے کام کیا اور خاصا وقت یکجائی میں گزرتا رہا۔ میں نے ان کی وہ تقریریں تو زیادہ نہ سنیں جن کی شہرت سے پاک و ہند کی فضا گونج رہی تھی اور خطابت میں انہیں قدرت کا ایک خاص عطیہ سمجھا جاتا تھا۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے متعلق جو کچھ ترک موالات کے آغاز سے سنتا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ واقعیت کا محض سرسری بلکہ نامکمل جربہ تھا۔ خطابت شاہ جی کے خداداد جوہروں میں سے صرف ایک جوہر تھا۔ اگرچہ زمانہ ان سے خطیب ہی کی حیثیت سے روشناس تھا اور اب بھی ان کا ذکر کرتے ہوئے خطابت ہی کو مرکزی وصف بنا دیا جاتا ہے۔ مجھے وہ اپنے دور کے بہت بڑے انسان نظر آئے۔ کیونکہ وہ بہت بڑے مسلمان تھے اول و آخر ظاہر و باطن مسلمان تھے۔ ان کے وجود کی مادیت و معنویت کا ذرہ ذرہ اسلامیت ہی کے مختلف پرتو تھے۔ جن کی وجہ سے وہ عمر بھر ہر حلقے میں مقبول و ہر دلعزیز رہے۔ چنانچہ مرحوم سالک کی گفتگوؤں سے شاہ جی کے متعلق محبت و عقیدت سے استفادہ کے بعد وہ "کالنقش فی الحجر" ہو گئے۔ چالیس سال کے لیل و نہار کا طویل زمانی دور گزر جانے کے بعد آج بھی وہ نقوش پہلے سے یکساں تاباں و درخشاں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ مجبور کن حالات کی بے پناہ رفتار نے ان سے قرب و یکجائی کے مواقع یک قلم ختم کر دیئے تھے۔ بلکہ لقاء و زیارت کی دولت بھی صرف اتفاق پر موقوف رہ گئی تھی۔ سیاسی دائرے میں بارہا ان سے اختلاف کی نوبت بھی آئی۔ بعض اوقات تو اختلاف مقابلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یعنی شاہ جی ایک فریق کے ساتھ ہوتے تو میرے فکر و نظر کا یہ تقاضا ہوتا کہ دوسرے فریق کا ساتھ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یکجائی کی نوبت بھی بہت کم آتی۔ لیکن پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے ساتھ محبت و عقیدت میں کبھی بسر موفرق نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیا۔ اور جس حد تک میرا اندازہ ہے ان کی شفقت و نوازش بھی بدستور قائم رہی۔ دراصل یہ اختلاف کبھی نہ ہوا اور منزل مقصود ہمیشہ ایک رہی جب کبھی باطمینان مل بیٹھنے کا موقعہ ملا شاہ جی کی گرمجوشیوں اور بہار آفرینیوں کے انہیں دل آویز کرشموں سے تمتع کیا جنہیں اتحاد و ہم آہنگی کے اوقات میں ایک خاص دولت سمجھتا تھا۔ شاہ جی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہ ان کے چہرے پر منعکس رہتا ہے۔ گویا ان کا چہرہ ایک صاف و شفاف اور مجلا آئینہ ہے۔ جس میں ہم ان کے باطن کی ہر کیفیت دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔

نادر شخصیت

ان کے سوانح حیات مرتب کرنے کی جرأت میں نہیں کرسکتا اس کے لئے بدرجہا بہتر نظر مراتب دقیقہ رس قوت موازنہ اور انتہائی موثر اور دلآویز اسلوب تحریر درکار ہے۔ ان کے فضائل و محامد بھی ایک سرسری مقالہ کے ظرف تنگ میں نہیں سما سکتے۔ ان کے لئے وسیع دائرہ بیان و نگارش کی ضرورت ہے۔ البتہ ان کی سیرت کی چند دلکش جھلکیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف چند جھلکیاں شاید اس طرح اندازہ کیا جاسکے کہ وہ کتنی گراں قدر عالی مرتبت اور نادر الاوصاف شخصیت کے حامل تھے۔ اور اسلامیت و انسانیت کی شکل میں ہمارے وطن عزیز کی وہ کتنی بیش بہا دولت ہیں وہ میدان عمل میں مصروف مجاہدات تھے تو لوگ ان کی زیارت کو باعث صد سعادت سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں لاکھوں کے مجمعوں کو اپنے دل آویز خطبات سے سراپا عمل و حرکت بنا دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ حریت و اسلامیت کے جانبازانہ جہاد میں گزار دیا۔ عمر کا خاصا بڑا جز قید و بند میں گزارا جو صلاحیتیں قدرت نے انہیں عطا کی تھیں وہ سب بے دریغ اسی راہ میں صرف کردیں۔ اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ عمر بھر فقر ان کے لئے سرمایہ فخر رہا۔ فقر میں ان کی سب سے زیادہ قیمتی خاندانی میراث تھی اور آج بھی ان کے فقر کا طرہ آسمان بوس ہے کہ وہ عرفی کے اس شعر کی زندہ مثال ہیں

باخون صد شہید مقابل نہادہ اند
عمرے کہ ماذ آتش افسانہ سوختیم

تاہم ہمارے دور میں کتنی صاحب حال نگاہیں اور کتنے صاحب حال دل ہیں جو شاہ جی کے اس مقام کا موازنہ کرسکیں۔ خود ان کی بے نیازی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ کامل استحقاق کے باوجود ایسی کوئی چیز ان کی زبان پر تو کیا آتی یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی۔

جہاد اسلامیت و آزادی

ہمارے گردو پیش نفسا نفسی کے جو ہنگامے اور معاوضہ خدمات کے جو محشر برپا رہے ان سے کون ناواقف ہے جو لوگ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہوئے تھے انہوں نے بھی اپنے کارناموں کے دفتر تیار کر کے معاوضے میں سب کچھ حاصل کرلیا جو ان کی دسترس میں آسکتا تھا۔ حالانکہ ان کے استحقاق کا معاملہ اصولاً محل نظر تھا۔ شاہ جی کی تمام عمر اس قاہر حکومت سے لڑنے میں بسر ہوئی۔ جس نے ہماری ہر مادی اور معنوی ثروت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غصب کر کے اپنی رگوں کے لئے زندگی کا خون مہیا کیا تھا۔ پھر ان کا پورا جہاد صرف آزادی کے لئے نہ تھا بلکہ اسلامیت آزادی کے لئے تھا۔ وہ اپنے وطن کو بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ اور مسلمانوں کو بھی آزاد تر، خود دار تر اور مخلص تر مسلمان دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اپنی عمر انہیں مقاصد کے لئے ایسی مصیبتوں اور دلگیریوں میں گزاری جن کا معمولی سا تصور بھی بڑے بڑے مدعیان ہمت و جرأت کو رعشہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر کیا کسی خدمت کے لئے کوئی صلہ طلب کیا؟ طلب کرنا تو رہا ایک طرف کبھی کسی خدمت کا ذکر بھولے سے بھی نہیں کیا۔ خوب سوچو، خوب غور کرو، پھر بتاؤ کہ ہمارے وطن عزیز میں ایسی بلند پایہ شخصیتیں کتنی ہیں۔

اسلامی معیار عظمت

شاہ جی بہرحال انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ ان کے ساتھ بھی زندگی کی وہ تمام ضرورتیں وابستہ تھیں جن سے ہر انسان محصور رہتا ہے۔ لیکن صلے کی طلب میں کیوں وہ ہزاروں لاکھوں سے الگ ہو گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اسلامی زندگی کا ایک اہم فرض تھا اور اہل حق کے نزدیک فرض اسی لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چون و چرا ادا کیا جائے۔ اگرچہ اس راہ میں کتنی ہی تکلیفوں، مشقتوں، صعوبتوں اور قربانیوں سے سابقہ پڑے۔ یہاں تک کہ جان بھی دے دینے کی نوبت آجائے تو ایک لمحے کے لئے ادائے فرض سے روگردانی گوارا نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کا اسوہ حسنہ ہمیں کیا بتاتا ہے کہ یہ قوم کو دعوت ہدایت دینے کے لئے اٹھے تو فرمایا "ہم تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے جس نے ہمیں پیدا کیا" جن بزرگ ہستیوں نے اس اسوہ حسنہ کی پیروی کو اپنا شعار بنایا وہ بھی ہم قوموں یا ہم رفیقوں سے کبھی کسی اجر کے روادار نہ ہوئے۔ انہوں نے جو کچھ کیا فرض سمجھ کر کیا۔ ان کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ اس رضا اور خوشنودی کے طلب گار اپنے کارناموں کی پاکیزہ دولت کو دنیوی صلوں کی تمنا سے آلودہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ کاش ہم لوگ سمجھ سکیں اور اندازہ کر سکیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تعلق اسی حقانی گروہ سے ہے۔ یہی انسانی عظمت و برتری کی حقیقی اساس ہے۔ افسوس کہ اس مقدس گروہ کے افراد آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ان کی جگہ لینے والے یہاں پیدا نہ ہوئے۔ شاہ جی اس وجہ سے بھی حد درجہ عزیز ہیں کہ اس گروہ سے متعلق ہیں اور اس وجہ سے بھی قابل صد احترام ہیں کہ جماعتی اور قومی معاملات کے سلسلہ میں صحیح اسلامی معیار کے آخری نمائندوں میں سے ہیں۔

دولت فقر اور سعادت اطمینان

یہی لوگ ہیں جن کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ جس طرف قدم بڑھے گراں قدر عملی جواہرات کے انبار فراہم ہو گئے۔ خود ان پر نظر پڑی تو فقر و درویشی پر اس طرح مطمئن ملے کہ بااقتدار بادشاہ اپنے تخت سلطنت پر اس قدر مسرور و مطمئن نہ ہوں گے۔ سچ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گر دولت این بود کہ بہ درویش دادہ اند
باید گریستن جم و کے را بہ تخت خویش

جو قلب مطمئن اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کو عطا کیا تھا وہ ہر جگہ نظر نہیں آسکتا۔ اطمینان قلب، دولت اقتدار، فرمانروائی یا وسعت املاک و احوال پر منحصر نہیں۔ صرف اللہ کے ذکر اور اس کے فضل و عطاء پر موقوف ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

پھر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس دور میں خدمت اسلامیت و آزادی کا بار گراں دوش ہمت پر اٹھایا تھا جب اخلاص و ایثار اتنے کم یاب نہ تھے۔ جتنے آج نظر آرہے ہیں۔ یعنی ترک موالات یا لاتعاون کے دور میں۔ اس تحریک میں جن جانبازوں نے حصہ لیا تھا ان میں خاصی بڑی اکثریت مخلص اور ایثار پرور کارکنوں کی تھی۔ اخلاص و ایثار کی ایسی مثالیں بہت کم تحریکیں پیش کر سکتی ہیں۔ شاہ جی کو اس جماعت میں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس سے ان کی عظمت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں صاحب دل بنایا تھا۔ اور دل ایسی نعمت ہے کہ ہزاروں جانیں بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتیں۔ عرفی نے بالکل درست کہا تھا۔

ہزار جان گرامی بہ نرخ جو نہ خرند
بہ عالمے کہ درد دل بہ کار می آید

آخر جان کی قدر و قیمت بھی تو دل کے ساتھ ہے۔ دل نہ ہو تو جان سے کون سا قابل ذکر کام انجام پاسکتا ہے۔ دنیا میں جتنے واجب احترام کارنامے ظہور پذیر ہوئے وہ دل ہی کی کارفرمائی کا کرشمہ تھے۔ آج کتنے افراد ہیں جو اس جنس گراں مایہ کے قدرشناس ہوں

فی ذالک فلیتنا فس المتنافسون

میں نے یہ چند سطور اس عالم میں لکھیں کہ اپنے خیالات و افکار کو اطمینان سے ترتیب دے لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ گویا ادھر سے ادھر چند پنکھڑیاں چن کر دامن عقیدت میں رکھ لیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بارگاہ عظمت میں جاؤں تو خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ ان کے متعلق سیر حاصل چیزیں لکھنے کے لئے زیادہ اطمینان و دل جمعی درکار ہے۔ یہ تو ایک دھندلا سا آئینہ ہے۔ یہ اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ ہم سب اسے سامنے رکھ کر دیکھیں کہ خود ہمارے ادعائے خدمت کے خدوخال کیسے ہیں۔ ہماری بینائی کتنی ہی غرض آلود اور ہماری صلاحیت موازنہ ماؤف ہو۔ مگر اس آئینہ میں اپنے عمل و کردار کی حقیقی حیثیت ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

تماشائے جمال حور و غلمانم کجا باشد
مرا آئینہ باید کہ بینم تاچہ حد زشتم

آج اس سلسلے میں شاہ جی کے آئینہ مجاہدات سے بہتر کون سا آئینہ ہوسکتا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر دور ہمارے سامنے گزرا۔ انہوں نے اسی فضا اور اسی ماحول میں اخلاص ایثار بلند ہمتی اور سچی اسلامیت کا وہ نقشہ پیش کیا جو دلوں میں مطلوب عمل کے ولولے پیدا کرسکتا ہے۔

© rasailojaraid.com